દ્વિમ માસિકનો વર્ષ

# مُسلِم انڈیا

## آل انڈیا مُسلِم لیگ

اجلاس مُنعقدہ الہ آباد

دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

# خطبۂ صدارت

از

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے - پی، ایچ، ڈی،

بیرسٹرایٹ لاء - لاہور

جس کو

ملک محمد اسلم خاں - ایم اے (کیمبرج) بیرسٹرایٹ لاء نے

رفیق عام پریس لاہور میں چھپوا کر کے صوفی منزل

پنڈی بہاؤالدین، پنجاب سے مُفت شائع کیا

سنہ ۱۹۳۱ء

16 AUG 1971

۷۸۶

# خطبۂ صدارت

حضرات!

مَیں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مُسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے۔ جب کہ مسلمانانِ ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صُورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اِس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں۔ جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور جن کی معاملات فہمی کا میں دل سے قائل ہوں لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی۔ اگر مَیں ان مسائل میں جن کے فیصلے کے لئے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ مَیں کسی جماعت کا رہنما نہیں نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ مَیں نے اپنی زندگی کا زائد حصّہ اِسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدّن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے جیسا کہ مختلف زمانوں میں اِس کا اظہار ہُوا ہے رہا ہے مَیں نے اِسی امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ

فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانانِ ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مُصر ہیں۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو۔ آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کردوں۔ جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیئے۔

## اسلام اور قومیّت

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظامِ سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو۔ لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا۔ جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دُنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہینِ منّت ہے۔ کیونکہ



اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و اوامر کی شرمندہ احسان ہے۔ جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دُنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جز بنالیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے۔ جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشوونما پایا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسیا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسیائی حکومت کے خلاف تھا۔ اس کو کسی دنیوی نظامِ سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی نظامِ سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا۔ کہ مسیح علیہ السلام کے عالمگیر نظامِ اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بیشمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے۔ جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے۔ اور لہٰذا ان کا حلقۂ اثر بالکل محدود رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے۔

کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسیو کی ذات سے ہُوا۔ اس نے مسیحی دُنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسانی سے متعلق تھا۔ اقوام و ملل کی تنگ حدود میں اُلجھ گئیں۔ اس لئے تخیّل حیات کے لئے انہیں ایک کہیں زیادہ واقعی اور مرئی اساس مثلاً تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخران سیاسی نظامات کی شکل میں ہُوا جنہوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔ یعنی جن کی بُنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۂ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دُنیا میں رونما ہُوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔ مسیح علیہ السّلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دُنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، کلیسیا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دُنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دُنیا



کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیئے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے۔ جس کا اظہار قیدِ مکانی و زمانی میں ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست والوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مُصر ہے کہ دُنیا اس اُصول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے۔ دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے۔ جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں۔ جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لُطف یہ ہے۔ کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحد یوروپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کو ایک ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے۔ جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا۔ لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصویر کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ السّلام کے دل میں موجود تھا۔ انہوں نے لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہرحال دُنیائے اسلامی میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنۂ متوسط کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور لہٰذا جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے

دُنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے۔ جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہدِ جدید کی واقعیات سے بالکل بیگانہ ہیں۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سرِ نو قوت پیدا کرنے کے لئے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصورِ قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیا ہوگا آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کرکے اس کو اسی طرح بدل دیگا۔ جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا۔ یا یہ کہ اس سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنک (Wensinck) نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اسی وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے۔ جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیش گوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں اُلجھا رکھا ہے۔ اور اس طرح



اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں۔ جو تعلیمات اسلامی کے مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہوں۔ مجھے امید ہے۔ کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو فہم انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اصلیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملے پر غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیگا۔ کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے۔ جس سے بطور ایک دستورِ حیات اور نظامِ عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے۔ جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متخیر تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا۔ جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے لیکن اس قسم کا قدم اُٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں یہ

نہیں چاہتا کہ جس انداز سے مَیں نے اس مسئلے پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات اتفاق نہیں ہے مَیں ان سے پیکار و مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اُس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزومند ہیں۔ میرا مقصود صرف اِس قدر ہے کہ موجودہ حالت کے متعلق ہمنے جو رائے قائم کی ہے اِس کا آزادی سے اظہار کردوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صُورت ہے۔ اِس امر کی کہ مَیں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منوّر کرسکوں۔

## قومیّت ہند کا اتحاد

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اِس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہُوا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں۔ لیکن اِس کے نظام سیاست کی بجائے اِن قومی نظامات کو اختیار کرلیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں۔ اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب



رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے مُنہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اِس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا۔ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں اُن کا اظہار ہُوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس سے باہر اس کے گردوپیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اوّلین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اِس لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے۔ الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کے ترک بھی لازم آئے گا۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوگا۔ جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصُول پر جو اسلام کے اصُول اتحاد کی نفی کرے مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانانِ ہندوستان کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان (RENAN) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کرسکتا ہے نہ مذہب کی۔ نہ دریاؤں کا بہاؤ اِس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سلسلیں اس کے دائرے کو محدود کرسکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے

اور اِن کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہیں کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائیگا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں۔ اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزما عمل ہے اس لئے کہ اِس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دُنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دینِ الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جائیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اِس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اِس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قایم رہے۔ لہٰذا اِس قسم کا اخلاقی شعور جو یہاں کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگریز ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت طیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے بھی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتہً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اِس بات پر مبنی ہے۔ کہ ہم قومیتِ ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو



چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہل ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک تعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اِس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختۂ مشق بن رہا ہے صلح و آشتی قایم ہو جائیگی بلکہ اِس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائیگا۔

باایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ ابتک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں۔ سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے۔ کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم تغلب و اقتدار کے خواہشمند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حائل ہو گئے ہیں۔ ان سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی وسیع اور فیاضانہ حب الوطنی کا ادعا ہے۔ لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اِس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشوونما میں آزادی کے ساتھ

قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی اُمید
سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہر کیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی
ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے
میں مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیے کے لئے
اس بنیادی اصُول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی روایات
وتمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے
وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ
اصُول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق
آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔ فرقہ داری کی بھی بہت سی
صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ داری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی
کی تعلیم دے اس کے ذلیل اور ادنٰے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری
قوموں کے رسوم وقوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی اوارات کی دل سے
عزت کرتا ہوں۔ بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے
تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں
بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع واطوار اور
میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت
اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ
زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرِ نو زندہ
ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی مری ذات میں سرگرم کار ہے۔



نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ داری کے اس عمدہ پہلو کا اعتراف
کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔
"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطۂ نگہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے
کا قیام مناسب نہیں۔ بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی
نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے
ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن
بین الاقوامی نصب العین کے گرم سے گرم حامیوں کو بھی اس امر کا
اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی
بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل
تمدنی آزادی کے بغیر اور یاد رکھئے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صُورت
میں فرقہ داری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں۔ ایک ہم آہنگ اور
متوازن قوم کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے"۔

## ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

لہٰذا ثابت ہُوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے
نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان
کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو۔ وہ ایک ہی نسل سے تعلق
رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن
ہے۔ جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے

اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم طیار کئے جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں۔ نہایت شد و مد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحدی، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے۔ خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا۔ کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائیگا۔ بیشک اگر رقبے کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست



کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہو گی غالباً قسمت ابالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائینگے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقے کی مرکزیت کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں۔ ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ واری قومی ہو جائیں گے اور ان کا جذبہ حب الوطنی بڑھ جائیگا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان (مسلمانوں کو اس امر کا موقعہ دیا گیا) کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوونما تقاضیں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ ان تمام بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات ہندو کے بہترین محافظ ثابت ہونگے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صدی ہے۔ لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۳۵ فی صدی

ہے اور اگر عساکر ہند کی کل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فی صدی ہو جائے گی۔ حالانکہ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبۂ سرحدی سے بھرتی کئے جاتے ہیں اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا بآسانی اندازہ کر سکیں گے۔ جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کے خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں۔ ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں یہ عرض کروں گا۔ کہ مسلمانانِ ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں۔ ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا۔ جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ ہو جائے۔

بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ کہ اسلام میں مذہب کا



مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ریاست ہے۔ جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے۔ جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سود کے متعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے۔ اسلامی حکومت نے شرح سود پر کوئی بابندیاں عاید نہیں کیں۔ میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا۔ اور اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر حاوی ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے۔ جو اس کی تہذیب و تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی۔ بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر

ہو جائیں گے۔

# فیڈرل ریاستیں

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے۔ کہ اگر ہم ہندوستان کی آئیندہ حکومت کے لئے کسی مستقل لسانی اور عقائد و معاشرت کے اختلافات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں جو زبان، نسل، تاریخ مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے۔ اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام سے عمل میں نہ آئے۔ بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمایندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ کی رو سے تقریباً انہی اصولوں کی بنا پر جن کا اظہار میں نے کیا ہے۔ صوبوں کی تقسیم بھی از سرِ نو ہو جانی چاہیئے۔ میں ان دونوں تجاویز کی دل سے تائید کرتا ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا۔ کہ صوبوں کی جدید تقسیم سے پیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے۔ اولاً یہ تقسیم نئے دستور کے اجرا سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیئے۔ ثانیاً اس کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں۔ اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہو گئی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس سیاسی جھگڑے کی بنا صوبوں کی موجودہ



تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے۔ کہ جداگانہ انتخابات کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ ان کے نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے۔ کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن ہندوستان کی یہ حالت نہیں۔ نہ ہم اس کے آرزومند ہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی، ان کی بیحد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں۔ اس امر کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملت کے مفاد کی پوری پوری نمایندگی ہو سکے گی۔ ناممکن ہے سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جائے۔ لیکن اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آجائے کہ ان کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل، ان کی زبان، ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

# سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے ہندو اور انگریز پنڈتوں نے جو دستور حکومت طیار کیا ہے۔ اس سے اس باریک اختلاف کا صاف پتہ چل جاتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے۔ ہندوستان کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں سرمو بھی فرق آئے۔ ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ ان اختیارات کو مرکزی مجلس وضع قوانین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے جس میں اس وقت بھی انہیں کی کثرت ہے اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہوا تو یہ کثرت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصول جمہوریت کا اطلاق ہو گیا۔ تو اس کا نتیجہ ان کے مفاد کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ حکومتوں میں کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فیڈریشن کے اصول پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں لیکن انہوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو مسلمانان ہند کے پیش نظر ہے۔ مسلمانوں نے فیڈریشن کا مطالبہ محض اس لئے کیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیے کی صرف یہی



ایک صورت ہے۔ برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولی طور سے کس قدر بھی درست اور محکم کیوں نہ ہو۔ اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا مشکل ہے۔ ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے ہندوستان میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس سے فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر انہوں نے کوئی غور نہیں کیا بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے۔ سائمن رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی کر دی ہے نہرو رپورٹ نے محض اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وحدتی نظام کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان پر بآسانی ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جاتا ہے۔ سائمن رپورٹ نے محض ایک لفظی فیڈریشن کی اسکیم پیش کی ہے جس کی تہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ انگریز طبعاً اس اقتدار سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے جو اب تک انہیں حاصل رہا ہے اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ نہ ہو سکا تو ان کو ہندوستان مستقلاً اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ایک اچھا عذر مل جائیگا۔ میں تو اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں وحدتی حکومت قائم ہو جن اختیارات کو فاضل (ResiDNARY) کہا جاتا ہے وہ صرف آزاد

ریاستوں کو ملنا چاہیئے۔ مرکزی فیڈرل ریاست کے ذمے صرف ایسے اختیارات رہنا چاہیئے جو تمام فیڈرل ریاستیں بطیب خاطر اس کے سپرد کر دیں۔ میں مسلمانانِ ہندوستان کو بھی یہ رائے نہیں دوں گا۔ کہ وہ کسی ایسے نظام حکومت سے خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندی اظہار اتفاق کریں۔ جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

## فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

پیشتر اس کے کہ انگریز مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لئے کوئی مؤثر ذریعہ پیدا کرتے اس امر کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر الامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیانِ ریاست کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے پیشتر گان ہندوستان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجا طور پر تعجب ہوا کہ والیانِ ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی۔ اور ہندوستان کے فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے طیار ہو گئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی جو اب تک وحدتی حکومت کے طرفدار چلے آتے تھے بغیر کسی تکلف کے فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کر لیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جب شاستری نے سرجان سائمن کی فیڈریشن والی اسکیم پر نہایت سخت نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن وہ بھی دفعتہً فیڈریشن پر



رضامند ہو گئے۔ اور اپنی اس رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس ہی میں کر دیا۔ جس سے وزیر اعظم انگلستان کو موقعہ ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں یہ سب کچھ خالی از علت نہیں۔ انگریزوں نے والیانِ ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے۔ دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے۔ انگریز مدبرین والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیان ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس اسکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصے میں کالعدم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کے فیڈریشن میں ہندو والیانِ ریاست کی اکثریت ہوگی۔ اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال درپیش ہوگا۔ تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی

نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے بالفاظ دیگر یہ اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان پر قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دونگا۔ جس میں تمہارا یعنی ہندوؤں کا غلبہ ہوگا۔ لہذا اگر یہ برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کریں تو پھر فیڈریشن میں والیانِ ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت اور انگریز حامیاں سلطنت کو خواہ وہ ٹوری جماعت سے ہو یا مزدور سے حقیقی اختیارات کی قوت سے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لہذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں ۳۳ فی صدی نشستیں حاصل ہوں۔ اسی ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا۔ جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان دونوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔ البتہ



رائٹر سے مختصراً یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو رپورٹ پیش ہوئی ہے۔ اس میں دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے۔ جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمایندے شریک ہوں گے۔ لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہوگی۔ جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ ابتدا میں فیڈریشن صرف برطانوی علاقے تک محدود ہوتا کسی ایسی فیڈرل اسکیم سے بھی جو استبداد اور جمہوریت کے ناپاک اتحاد پر مبنی ہو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدتی حکومت کا تختۂ مشق بنا رہے۔ یہ وحدتی حکومت ممکن ہے کہ انگریزوں کے لئے مفید ہو اور والیان ریاست اور اکثریت کے لئے بھی۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے لئے فائدے کی کوئی توقع رکھنا بیسود ہے جب تک کہ انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں پورے پورے "فاصل" اختیارات کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہو جائیں۔ اور مرکزی فیڈرل اسمبلی کی کل تعداد میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ ملیں۔ جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے حاکمانہ (SOVEREIGN) اختیارات کا تعلق ہے ہز ہائنس نواب بھوپال، سر اکبر حیدری اور

مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں۔ لہذا مرکزی مجلس کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہیئے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا۔ بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن نے مسلمانوں کی نمایندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ ان اسلامی ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہوں۔ ہمیں تمام فیڈریشن میں ۱/۳ نشستیں حاصل ہوں۔

## مسئلۂ دفاع

ہندوستان میں فیڈرل نظام قایم کرنے میں ایک بہت بڑی دقت دفاع و حفاظت کی ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھ لیا ہے۔ تاکہ جنگی نظم ونسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

"ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ دفاع کو اب نہ مستقبل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دفاعی عساکر کا نظم و نسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہیئے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے۔ کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی



افسروں کی امداد کے بغیر ہندوستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں۔ برطانوی ہندوستان میں ذمہ وارانہ حکومت قائم نہیں ہو سکتی؟ موجودہ حالت میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے۔ کہ یہ واقعی ہندوستان کی آہنی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اُصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ کہ جب کبھی ہندوستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں۔ ان کا مطلب یہ بھی ہوگا۔ کہ فوجوں کا نظم و نسق ہندوستان کی منتخبہ مجلس وضع قوانین کے ماتحت ہو تو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں۔ کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جس کا اعلان ۲۰ راگست ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا۔ معرض خطر میں آجائے گی"

اپنے بیان کی مزید تائید کے لئے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے۔ کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان جن کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ ایک تصادم رونما ہے۔ پھر یہ کہکر اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ

"یہ حقیقت کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندوستانی

ایک قوم نہیں ہیں۔ اور یہ بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ جب یہ دیکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے"

اس مسئلے کے ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے۔ کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی "غیر جانبدار محافظ" ہیں۔ بہر حال فیڈریشن میں جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں۔ اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائیگا۔ یعنی ہندوستان کے خارجی تحفظ کا۔ صوبجاتی عساکر کے علاوہ جو ہندوستان کے اندرونی امن و سکون کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان کی فیڈرل کانگریس صوبۂ سرحدی میں ایک طاقتور سرحدی لشکر متعین کر سکتی ہے۔ جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت ہر ملت کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہوگی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے۔ کہ ہندوستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں۔ اور یہی چیز ہے۔ جس سے فائدہ اٹھا کر ارکان کمیشن یہ کہتے ہیں۔ کہ افواج کا نظم و نسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔ لیکن میں اس کے متعلق انہی کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کروں گا۔ جس سے خود ان کا یہ اندازہ قابل اعتراض نظر آتا ہے۔



"اس وقت کوئی ہندوستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو کپتان سے اونچے عہدے پر فائز نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد ۳۹ ہے۔ جن میں سے ۲۵ معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اسی قدر زیادہ ہے۔ کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ جب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کا اکثر حصہ سینڈہرسٹ نہیں گیا۔ بلکہ انہیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا تھا۔ اب یہ خواہش کہ صورت حالات میں تغیر پیدا کیا جائے۔ کس قدر سچی کیوں نہ ہو اور اس کے لئے کیسی بھی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے وہ شرائط جن کو اسکین کمیٹی نے (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نہایت موثر طریق پر لفظ "ترقی ...... میں جمع کر دیا ہے۔ اس امر پر منحصر ہیں۔ کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو۔ اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار لازماً سست رہے گی۔ موجودہ ہندوستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں۔ اور ان کا تجربہ محدود ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں۔ کہ وہ ایک قلیل عرصے کے اندر اعلےٰ مراتب حاصل کر لیں۔ جب تک ہندوستانی امیدواروں کی قلیل جماعت

اضافہ نہ ہو جائے؟ ہم اس اضافے کے دل سے خواہشمند ہیں۔ جب تک ہندوستانیوں کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کرلے کہ جس سے سب نہیں تو کم از کم کچھ رجمنٹوں کے تمام افسر صرف ہندوستانی ہوں جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ اس وقت تک یہ ممکن نہ ہوگا۔ کہ فوج کے نظم ونسق کو ہندوستانیوں کے ذمے سپرد کردیا جائے۔ اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے کہ ساری فوج کلیتہً ہندوستانی ہو جائے۔ اس حالت میں بھی اس کام کی تکمیل کے لئے ساٹھ سال کی ضرورت ہوگی"۔

اب میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری خرابی ہے۔ یا فوجی تعلیم کی سست رفتار؟ ہماری جنگجو قوموں کی صلاحیت مسلمہ ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے جنگی تعلیم کا عمل سست ہو۔ میں عسکریات کا ماہر نہیں۔ لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اس دلیل کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا گویا ہندوستان کی غلامی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ لہذا ضروری ہے۔ کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم ونسق ایک



دفاعی کمیٹی کے ذمے کردیا جائے۔ اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیے سے ہو۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی بری سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس کے بحری تحفظ کے متعلق صرف سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ ایک آزاد اور خودمختار ہندوستان کے لئے از بس ضروری ہے۔ کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے۔ کہ اگر فیڈرل ریاست قائم ہوگئی۔ تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندوستان کے تحفظ کی خاطر ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام کے لئے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہو۔ ہر قسم کی امداد دینے پر آمادہ ہوں گی۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانبدار عساکر واقعتہً موجود تھے۔ بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی افواج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظام حکومت ایک غیر جانبدارانہ ہندوستانی لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے

49022



جذباتِ حب الوطنی اور زیادہ قوی ہو جائیں گے۔ اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا۔ کہ اگر باہر سے کوئی حملہ ہُوا تو مسلمانانِ ہندوستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

## اسلامی مطالبات

مَیں نے مختصراً اس امر کی فصاحت کر دی ہے۔ کہ ہندوستان کے دو آہنی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے۔ کہ فرقہ وارانہ مسائل کے مستقل تصفیے کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم از سرِ نو ہو جائے۔ لیکن اگر مسلمانوں کا مطالبہ مسترد کر دیا جائے۔ تو پھر اس میں نہایت شد و مد کے ساتھ اِن مطالبات کی تائید کروں گا۔ جن کا اعلان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بار بار کیا گیا ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان کسی ایسی آہنی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے جس کے ماتحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں۔ یا مرکزی مجلس میں انہیں ۳۳ فی صدی نشستیں نہ مل جائیں۔ اب تک مسلمانوں کے سیاسی رہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔ پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے۔ جسے قومیت ہند کے غلط تصور پر مرتب



کیا گیا تھا۔ اور جس کے ماتحت مسلمان اِن تمام مواقع سے محروم رہ جاتے تھے۔ کہ وہ اس مُلک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں۔ دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد و اتفاق کی وہ ناعاقبت اندیشانہ قربانی ہے۔ جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہُوا ہے۔ جس سے پنجاب کے مُسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ لیگ کا فرض ہے۔ کہ وہ میثاق اور تجویز دونوں کی مُذمّت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے بنگال اور پنجاب میں اِن کے لئے آہنی اکثریت کی سفارش نہیں کی۔ اس کا مطالبہ یہ ہے۔ کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کر لیں۔ حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق جو یادداشت بھیجی ہے۔ اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے۔ کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے اِن دونوں تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا۔ یادداشت میں لکھا ہے۔ کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہے۔ کہ انہیں بنگال اور پنجاب میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمایندگی کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔ محض یہ امر کہ ان دوسرے صوبوں میں پاسنگ" حاصل ہے۔ اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا۔ لیکن تعجب خیز بات یہ ہے۔ کہ اس یادداشت

میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔
جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ حکومت ہند نے بھی اسی "نہایت
احتیاط سے طیار کی ہوئی متوازن اسکیم" کی حمایت کی ہے۔ جس کو
پنجاب کونسل کے سرکاری ممبروں نے مرتب کیا تھا۔ اور جس کے
ماتحت مسلمانانِ پنجاب کو پوری مجلس میں صرف ۴۹ فیصدی نشستیں
ملتی ہیں۔ اور ہندوؤں اور سکھ اراکین پر صرف دو کی اکثریت حاصل
ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کی مثال بجائے خود اس قدر فیصلہ کن
ہے۔ کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانانِ
پنجاب کسی ایسی اسکیم کو تسلیم نہیں کر سکیں گے۔ جس کی رُو سے انہیں
پوری مجلس میں قطعی اکثریت حاصل نہ ہو جائے۔ بہر حال لارڈ اروِن
اور ان کی حکومت کو اس امر سے اتفاق ہے۔ کہ جب تک حق
رائے دہندگی اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر ملت کا تناسب
آبادی واضح طور پر اس کے نمایندوں سے ظاہر ہو سکے۔
اور جب تک تمام مسلمان باتفاق رائے جُداگانہ نمایندگی کے حق
سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ ہندوستان کی اقلیتیں اس امر کی
مجاز ہوں گی۔ کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھیں۔ لیکن میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حکومت ہند کے نزدیک مسلمانوں کی
شکایت بجا ہے۔ تو اسے اتنی جرأت کیوں نہیں ہوئی کہ وہ پنجاب
اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آہنی اکثریت کی سفارش کرتی۔



(۱) مسلمانانِ ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہوگا
جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے۔ یا شمال
مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان
کے دوسروں صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو باہم ملا کر
ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہیئے۔ احاطۂ بمبئی اور سندھ میں کوئی
چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے۔ کہ اہل
سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے۔
نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے
آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت
کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے۔ کہ "سندھ
وہ ملک ہے۔ جو مملکت اسلامی سے قریب تر ہے"۔ سب سے
پہلے اموی خلیفہ کا قول تھا۔ کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے۔
اور مُنہ عرب کی۔ مناسب ردّوبدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے
تعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف
ہے۔ اور مُنہ وسط ایشیا کی جانب علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان
زراعتی مسائل جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں۔ اور
اس کی بیشمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے۔ اس لئے
کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا
دارالسلطنت بن جائے گا۔ تو صاف نظر آجاتا ہے۔ کہ اس کو

احاطہ بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دُور ہے۔ بیشک اِس وقت بمبئی کا رویّہ دوستانہ ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں۔ اس کے یہ معنی تو نہیں۔ کہ حکومت ہند اُمید افزا صوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے۔ کہ اراکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے۔ کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ اِن کی سفارشات برے (BRAY) کمیٹی سے بھی کم ہیں۔ اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں۔ محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے۔ کہ وہ ایک بارودخانے میں رہتے ہیں۔ اراکان کمیشن کی یہ دلیل کس قدر بھی لطیف کیوں نہ ہو۔ اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے۔ نہ کہ آگ کی اور ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم تمام



انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں۔ خواہ وہ خانہ بارود میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ افغان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں وہ ہر ایسی کوشش کی شدّت سے مزاحمت کریں گے۔ جو ان کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کیلئے مفید ہے گذشتہ ایام میں اس بدقسمت صوبے میں جو المناک واقعات پیش آچکے ہیں۔ وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں۔ جو ہندوستان میں اصول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لیکر اب تک اس سے روا رکھا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھیں گے۔ کہ اس صوبے میں جو کچھ پیش آرہا ہے۔ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند نے بھی اپنی یادداشت میں صوبۂ سرحدی کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے۔ وہ ناکافی ہیں۔ بیشک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع ہے۔ کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینے کی تجویز کی گئی ہے۔ لیکن حکومت ہند نے بھی اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ

نہیں دیا۔ جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ افغان جبلتاً اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں۔ کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری ادارات میں حصّہ لیں۔

## راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

میرا خیال ہے کہ اب مجھے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق چند سرسری اشارات کر دینا چاہئے۔ ذاتی طور سے مجھے اس کانفرنس سے کوئی امید وابستہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور تصوّر کیا جاتا تھا۔ کہ فرقہ وارانہ منازعات کے رزمگاہ سے دور ایک بدلی ہوئی فضا میں لوگ کہیں زیادہ ہوشمندی سے کام لیں گے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ فرقہ وارانہ مسائل پر جو بحث لنڈن میں ہوئی ہے۔ اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح ہوگیا ہے۔ بایں ہمہ وزیر اعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہے۔ کہ ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے۔ قومی نہیں۔ انہوں نے کہا ہے۔ "یہ ایک دشوار بات ہوگی۔ کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کی تجاویز پیش کرے اس لئے کہ مخلوط انتخابات انگریزی کے جذبات جمہوریت پسندی کے زیادہ قریں ہیں"۔ انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا



کہ ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد قومیں آباد ہوں۔ برطانوی جمہوریت کی صورت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہونا تو یہ چاہیئے۔ کہ اس مسئلہ کو جغرافیائی اصول پر حل کیا جائے۔ جداگانہ انتخابات کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر پہنچے۔ آخرالامر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا۔ ہمیں امید ہے۔ کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمایندے اس مسئلے کو محض سطحانہ نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے۔ جیسا کہ ابتک ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے۔ بلکہ ان کی نگاہیں اس معاملہ کی تہ تک پہنچ جائیں گی۔ اور وہ محسوس کرلیں گے۔ کہ ہندوستان کے اندر امن وسکون کے قیام کا طریق کیا ہے۔ ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہوگا۔ کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے۔ یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں۔ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کو نادانستہ خانہ جنگی کے لئے طیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے۔ اس ملک میں اس وقت تک امن وسکون قائم نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس امر کو تسلیم نہ کرلیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں

پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اِس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پُورا پُورا احساس ہے۔ جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ اِن کا یہ اصرار بالکل بجا ہے۔ کہ مرکزی حکومت میں ذمہ واری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ منازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مُسلمان سیاسی رہنما کو اِس طعن آمیز لفظ (یعنی لفظ "فرقہ واری") کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ جسے ہندو محض پراپیگنڈا کی خاطر استعمال کر رہے ہیں۔ تاکہ بقول وزیر اعظم وہ انگلستان کے جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اور انگریز غلطی سے یہ فرض کر لیں کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یک رنگ قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں۔ اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں۔ لیکن ابھی تک اِن کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لئے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بیشک ہندو اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں۔ مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے



ہی مسلمان رہنماؤں ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر ہونا نہیں چاہیئے۔ کہ ترکی، ایران اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے اُصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانانِ ہندوستان کی حالت اِن سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے۔ اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اِن کا تعلق باصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے۔ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں اگر کوئی یہودی، عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھُو لے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رُو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اوّلین قدم تھا۔ جو اسلام نے عملاً اتحاد بنی نوع انسانی کی خاطر اُٹھایا۔ اِس نے اِن لوگوں کو جن کا اخلاقی نصب العین تقریباً ایک سا تھا۔ باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ اھل الکتاب تعالوا علیٰ کلمۃٍ (یعنی توحید) سواءً بیننا وبینکم یہ الگ بات ہے۔ کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ و جدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقعہ نہیں دیا کہ دنیائے اسلامی اس آیت کے لانتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہرحال آج بلاد اسلامیہ میں یہ مقصد اسلامی قومیت کی شکل میں پُورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس ایک امر سے کر سکتے ہیں۔ کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرارداد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا۔ تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہوگا۔ اس وقت ضرورت ہوگی۔ کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ہو کر کوئی آزادانہ سیاسی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین پر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں۔ تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے طیار رہنا چاہیئے۔ ہمارے سربرآوردہ لوگوں نے کافی غور و خوض سے کام لیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہیں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ کہ ہم لوگ ان قوموں سے آشنا ہوئے ہیں۔ جو ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر ہماری آئندہ قسمتوں کو تشکیل میں کارفرما ہیں لیکن میں آپ سے اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس غور و فکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے۔ کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت آئے تو ہم اپنے آپ کو اسی قسم کے عمل کے لئے طیار پائیں جو حالات کے مقتضی ہو؟ مجھے آپ سے بلا تکلف کہہ دینا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے۔ کہ ہم شخصیتوں کا وجود



نہیں۔ سر مالکم ہیلی اور لارڈ آروِن کی تشخیص بالکل صحیح تھی۔ جب انہوں نے علیگڈھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ ملتِ اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں۔ جن کو عنایت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو۔ کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے۔ دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے یہ ہے۔ کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں۔ اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو طرزِ عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا تھا۔ اب وہی سیاسیات میں ہو گیا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا۔ اس لئے ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہمیں اس اصول سے دلچسپی ہے۔ جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید برآں یہ اصول اس قدر وسیع ہے۔ کہ کسی فرقے کو اس قدر جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ

اسلام کی حدود ہی سے باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا۔ بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے۔ تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا سوال یہ ہے۔ کہ اِن دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے۔ اوّل الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہم اس کا دفعیہ کر سکتے ہیں۔ مَیں نے اِس موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ مَیں اِس وقت تک اس کا اظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صُورتِ حالات پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہُوا تو تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ اِن کے خیالات کچھ بھی ہوں فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں۔ اور صرف قرار دادیں ہی منظور نہیں کریں۔ بلکہ اپنے مقاصد میں حقیقی کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے سامنے کوئی راہ عمل پیش کریں۔ مَیں نے اِس امر کا تذکرہ صرف اِس لئے کر دیا ہے۔ کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔



# خاتمۂ سخن

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں مَیں صرف اتنا عرض کروں گا۔ کہ مسلمانانِ ہند اِس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دَور میں سے گذر رہے ہیں۔ اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملّی وجود کی بقا اور ہندوستان کا مفاد صرف ایک اسی امر سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اسے اظہارِ ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے۔ جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہُوا تھا۔ ہم پر ایک فرض ہندوستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ جو ہمارا وطن ہے۔ اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے۔ اور ایک فرض ایشیا بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے اور چونکہ ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی اسلام کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم ہندوستان کے مسئلے پر محض زاویۂ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی غور کریں۔ ایشیا اور

ہندوستان کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان کی بجا آوری اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک ہم اپنے ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہیں کرلیں گے۔ اگر آپ ہندوستان کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لئے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے۔ جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو۔ اور اس کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا از خود نشوونما ہوتا ہے؟ کیوں نہیں۔ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جائیں۔ اور پھر اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے خواہ وہ



مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھئے۔ مادہ کثرت ہے۔ لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ صرف اسلام تھا۔ جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں۔ اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں۔ تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائے گی۔ اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے۔ کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے۔ جیسے ایک نفس واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجا طور پر یہ دعوے کر سکتے ہیں۔ کہ یہ ہمیں تھے۔ جو سب سے پہلے انسانیت [illegible] بلند۔ اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے۔ ایک واحد کی طرح زندہ رہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی حالت وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ میں کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کے صحیح معنے آپ پر اسی وقت آشکارا ہو سکیں گے۔

جب آپ اِن کے مشاہدے کے لئے ایک صحیح اجتماعی
انا پیدا کرلیں گے ۔ علیکم انفسکم، لا یضرکم من
ضل اذا اھتدیتم (۵ : ۱۰۴)

مُترجمہ

سیّد نذیر نیازی ۔ بی ۔ اے

(جامعہ)